مرزا سبحان بیگ، بھوپال

اسلامی تحریکات نئے دور میں: پر ایک نظر

''زندگی نو'' جولائی ۲۰۰۹ء میں شائع شدہ ڈاکٹر عبدالسلام احمد ایم کے مضمون ''اسلامی تحریکات نئے دور میں'' کے سلسلے میں چند معروضات پیش ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے:

''کسی بھی زمانے کی اسلامی تحریک کسی تازہ وحی کی بنیاد پر نہیں چلتی ہے، بلکہ اس کا مناسب طریقۂ کار انسان اپنے تجربے کی روشنی میں اپنے زمانے کو سامنے رکھتے ہوئے تجویز کرتا ہے۔ جب زمانہ بدلتا ہے اس کے ساتھ تحریک بھی بدلتی ہے۔'' (ص:۵۶)

''زمانہ ایک ایسی حقیقت ہے جو تمام امور میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وحی تک اس کا لحاظ رکھتی ہے۔ حضرات انبیاءؑ کے دعوتی کاموں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان کے زمانے کا اسلام کس طرح آپس میں مختلف رہا ہے۔'' (ص:۵۶)

تعلیم وتفہیم کے لیے ضروری تھا کہ ایک قوم کو ایسی زبان میں پیغام بھیجا جائے جسے وہ سمجھتی ہو، حتیٰ کہ ایک ہی نبی کے کام زمانے کے تغیر کے ساتھ بدلتے ہیں۔ اس کی بڑی مثال خود حضورؐ کے عظیم کارنامے ہیں۔ حضورؐ نے مدینہ منورہ میں جو کام کیے اس ترتیب سے نہیں تھے جس ترتیب سے مکہ میں کیے۔ اور قرآنی سورتوں کی مکی اور مدنی جیسی ترتیب دینا بھی اتفاقی نہیں۔'' (ص:۵۷)

جب زمانے کے تغیر کے ساتھ اسلام بھی اس معنی میں متغیر ہوتا چلا جاتا ہے تو انسانوں کی قائم کردہ تحریکوں کے تغیر پذیر ہونے میں حرج کیا ہے۔'' (ص:۵۷)

''تحریک کسی بھی طرز کی ہو، وہ زمانے کے ساتھ نہ چلتی ہو تو زمانہ اس کے لیے مقبرہ تیار کردیتا ہے۔'' (ص:۵۷)

موصوف نے ''زمانے'' کو غیر معمولی اور بنیادی اہمیت کا حامل قرار دے دیا ہے۔ ان کے نزدیک زمانہ ہی سب کچھ نظر آتا ہے۔ حالانکہ زمانہ کیا ہے؟ وقت، جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات اور اس کی ہر شئے

بشمول انسان کی زندگی کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ کسی اَمر میں زمانہ کوئی رول ادا کرتا ہے یہ بات ہی بے معنی ہے۔ تمام اُمور میں حقیقی اور اہم رول تو ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا حکم، اس کی مشیّت اور اس کا قانون فطرت۔ البتہ یہ کہا جاے اور کہہ سکتے ہیں کہ گزرے ہوے انسان نے اس دنیا کو جس طرح برتا اور موجودہ انسان جس طرح برت رہا ہے، اُسی کا نام زمانہ ہے، تو اس میں بَس رول ہوگا۔ انسان کا یا اس کے طرز فکر و عمل کا اور یہی حقیقت ہے۔ موصوف تحریک اسلامی سے جو کچھ چاہتے ہیں اس کا لُب لباب یہ ہے کہ ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' یا ''زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بساز'' (اگر زمانہ تیرا ساتھ نہیں دیتا ہے تو تجھے زمانے کا ساتھ دینا چاہیے) لیکن یہ تو مذہب گوسفنداں ہے، نہ کہ کیشِ مرداں، اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ اس طرح واضح کرتے ہیں ع

حدیثِ بے خبراں ہے، تو بازمانہ بساز
زمانہ باتو نہ سازد، تو بازمانہ ستیز

اور اسی حقیقت کو، جو کسی بھی انقلابی تحریک بالخصوص اسلامی تحریک اور اس کے علمبرداروں میں سب سے زیادہ نمایاں رہی ہے، مولانا مودودیؒ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستے پر رواں کردے جو اس کے ایمان واعتماد میں راہ راست ہے، صراط مستقیم ہے۔ اگر دریا نے رُخ اس راستے سے پھیر دیا ہے تو حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے وہ اس غلط رُو دریا کی رفتار سے لڑے گا۔ اس کا رُخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کردے گا، کامیابی اور ناکامی کی اس کو قطعاً پروا نہ ہوگی۔ وہ ہر اس نقصان کو گوارا کرلے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو۔ حتّٰی کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازوٹوٹ جائیں، اُس کے جوڑ بند ڈھیلے ہوجائیں، اور پانی کی موجیں اس کو نیم جان کرکے کسی کنارے پر پھینک دیں، تب بھی اس کی روح ہرگز شکست نہ کھائے گی۔ قرآن تمھارے سامنے ہے، انبیاء کی سیرتیں تمھارے سامنے ہیں۔ ابتداء سے لے کر آج تک علمبرداران اسلام کی زندگیاں تمھارے سامنے ہیں۔ کیا ان سب سے تم کو یہی تعلیم ملتی ہے کہ ہوا جدھر اُڑائے اُڑ جاؤ؟ پانی جدھر بہائے اُدھر بہہ جاؤ؟ زمانہ جو رنگ اختیار کرے اُس رنگ میں رنگ جاؤ؟ اگر مدّعا یہی ہوتا تو کسی کتاب کے نزول اور کسی نبی کی بعثت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ہَوا کی موجیں تمھاری ہدایت کے لیے اور حیات دنیا کا بہاؤ تمھاری رہ نمائی کے لیے اور زمانہ کی نیرنگیاں تمھیں گرگٹ کی روش سکھانے کے

لیے کافی تھیں۔ خدا نے کوئی کتاب ایسی ناپاک تعلیم دینے کے لیے نہیں بھیجی اور نہ اس غرض کے لیے کوئی نبی مبعوث کیا۔ اس ذات حق کی طرف سے تو جو پیغام بھی آیا اس لیے آیا کہ دنیا جن غلط راستوں پر چل رہی ہے ان سب کو چھوڑ کر ایک سیدھا راستہ مقرر کرے، اس کے خلاف جتنے راستے ہوں ان کو مٹانے اور دنیا کو ان سے ہٹانے کی کوشش کرے، ایمان داروں کی ایک جماعت بنائے جو نہ صرف خود اس سیدھے راستے پر چلیں بلکہ دنیا کو بھی اس کی طرف کھینچ کر لانے کی کوشش کریں۔ انبیاء اور اُن کے متبعین نے ہمیشہ اس غرض کے لیے جہاد کیا۔ اس جہاد میں اذیتیں اٹھائی ہیں، نقصان برداشت کیے ہیں اور جانیں دی ہیں۔ یہ خیال کہ زندگی کا دریا جس رُخ پر بہہ گیا ہے اس سے وہ پھیرا نہیں جا سکتا۔ عقلاً بھی غلط ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی اس کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ دنیا میں ایک نہیں سینکڑوں انقلاب ہوئے ہیں اور ہر انقلاب نے اس دریا کے رُخ کو بدلا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال خود اسلام میں موجود ہے۔ محمدؐ جب دنیا میں تشریف لائے تو زندگی کا یہ دریا کس رُخ پر بہہ رہا تھا؟ کیا تمام دنیا پر کفر و شرک کا غلبہ نہ تھا؟ کیا استبداد اور ظلم کی حکومت نہ تھی؟ کیا انسانیت کو طبقات کی ظالمانہ تقسیم نے داغدار نہ بنا رکھا تھا؟ کیا اخلاق پر فواحش، معاشرت پر نفس پرستی، معیشت پر ظالمانہ جاگیرداری و سرمایہ داری اور قانون پر بے اعتدالی کا تسلط نہ تھا؟ مگر ایک تن واحد نے اٹھ کر تمام دنیا کو چیلنج دے دیا، تمام ان غلط خیالات اور غلط طریقوں کو رد کر دیا جو اس وقت دنیا میں رائج تھے۔ ان سب کے مقابلے میں اپنا ایک عقیدہ اور اپنا ایک طریقہ پیش کیا اور چند سال کی مختصر مدت میں اپنی تبلیغ اور جہاد سے دنیا کے رُخ کو پھیر کر اور زمانے کے رنگ کو بدل کر چھوڑا انقلاب یا ارتقاء ہمیشہ قوت ہی کے اثر سے اونچا ہوا ہے، اور قوت ڈھل جانے کا نام نہیں ڈھال دینے کا نام ہے۔ مُڑ جانے کو قوت نہیں کہتے، موڑ دینے کو کہتے ہیں۔ دنیا میں کبھی نامردوں اور بزدلوں نے کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا۔ جو ہر سانچے میں ڈھل جائے اور ہر دباؤ سے دب جانے والے ہوں ایسے لوگوں کا کوئی قابل ذکر کارنامہ انسانی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ تاریخ بنانا صرف بہادر مردوں کا کام ہے، انھی نے اپنے جہاد اور قربانیوں سے زندگی کے دریا کا رُخ پھیرا ہے۔ دنیا کے خیالات بدلے ہیں، مناہجِ عمل میں انقلاب برپا کیا ہے۔ زمانے کے رنگ میں رنگ جانے کے بجائے زمانے کو خود اپنے رنگ میں رنگ چھوڑا ہے۔''

(تنقیحات'': ''کیش مرداں نہ کہ مذہب گوسفنداں'')

مضمون نگار اس حقیقت سے ناواقف نظر آتے ہیں کہ تحریک اسلامی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ اسلام کی۔ ہر نبی انسان ہی تھا اور ہر نبی کا دین اسلام ہی تھا، جس کی اقامت اس کا نصب العین تھا، یعنی یہ کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، طاغوت سے دور رہے، نیز کسی تفریق و تقسیم کے بغیر ہر طرف سے یکسو ہو کر پورے دین (بشمول اس شریعت کے جو اس کو منجانب اللہ دی گئی تھی) کی مخلصانہ پیروی کرتے ہوئے اُسے اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں جاری و نافذ کرے۔ اِسی جدوجہد کا نام تحریک اسلامی ہے، جو نبی کی موجودگی میں اس کی قیادت میں ''تازہ وحی'' ہی کے تحت چلتی اور دنیا سے اس کے رخصت ہو جانے کے بعد اُس پر نازل شدہ وحی اور اُس کی سنّت کے تحت اُس کے پیروؤں کے ذریعے چلتی ہے۔ کسی بھی نبی کا دین مختلف نہیں تھا۔ نہ بنیادی عقائد میں کوئی فرق تھا، نہ عبادات میں کوئی فرق تھا نہ ہی عبادات کے بنیادی طریقے میں۔ ''زمانے کے ساتھ یا تجربہ کی روشنی میں'' کسی نبی کا نہ دین بدلا نہ تحریک بدلی اور نہ ہی بنیادی طریقۂ کار بدلا۔ ہر نبی اور اس کی قیادت میں چلنے والی تحریک کا نقشۂ کار بنیادی طور پر ایک ہی نوعیت کا تھا، ماحول اور زمانے کے اختلاف کے سبب تفصیلات میں ضرور کچھ فرق تھا، لیکن اصولی اور بنیادی فرق ہرگز نہیں تھا۔ سینکڑوں اور ہزاروں برس کے بعد اور حالات کے فرق کے اختلاف کے باوجود کام کے نقشے ایک ہی سے رہے ہیں۔

موصوف مزید فرماتے ہیں کہ:

☆ ''اسلامی تحریکوں کو اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ تغیرات ایک کرشمہ ہیں۔ پہلے ایک حالت کو دوسری حالت میں بدلنے میں دس سال لگتے تھے، لیکن اب اس کے لیے دس دن کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' (ص:۵۸)

☆ ''آج کل اسلامی تحریکیں جاہلی قوم سے کنارہ کش ہو کر انھیں اپنے ارشادات اور فلسفیانہ نصیحتوں سے نوازنے کا گروہ بننے کے بجائے ان کے ساتھ مل جل کر کام کرنے والی عوامی تحریکیں بن چکی ہیں۔ ایک زمانہ میں اسلامی تحریکیں نظریات کا دفاع نظریات سے کرتی تھیں۔ چونکہ وہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان اصولی فرق کو درخشاں کرنے کا زمانہ تھا، وہاں میل جول اور مشارکت کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، اس لیے اسلام ایسا ہی تھا۔'' (ص:۶۰)

☆ ''عام طور پر لوگ تحریک کو اس بنیاد پر دیکھتے ہیں کہ وہ ان کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے کیا خدمات انجام دیتی ہیں، نہ کہ اس کی فلسفیانہ اصول کی بنیاد پر۔ دنیا کی کوئی تحریک اس وجہ سے معتبر نہیں مانی جاتی ہے کہ اس کے اصول بہت عمدہ ہیں جب کہ وہ اجتماعی مسائل کو نظر انداز کرتی ہو۔ برعکس اس کے جو تحریک اجتماعی مسائل کے حل کو اپنا مقصود بناتی ہے لوگ

اس کے اصولوں کو خواہ کسی طرز کے ہوں، قبول کرتے ہیں اور اس کے ساتھ تعاون کرنے لگتے ہیں۔ یہ جان لینے کے بعد اب اسلامی تحریکیں اس کے فلسفیانہ بندشوں سے نکل کر ایک سوشل جماعت (Social Group) بننے کی کوششوں میں ہیں۔'' (ص:۶۲)

خدا جانے کن تغیرات کو نظر انداز نہ کرنے کی اسلامی تحریکوں کو نصیحت کی جارہی ہے؟ کیا کائنات کے حقائق اور قوانین فطرت میں تغیر ہو چکا ہے؟ کیا انسانی فطرت اور شر و خیر کی فطرت بدل گئی؟ کیا یہ تغیر رُونما ہو چکا ہے کہ اب قومیں یا انسانی گروہ آناً فاناً اپنے مذہب و تہذیب اور فکر و خیال کو بدل دیتی ہیں؟ کیا یہ حقیقت بھی اب تغیر پذیر ہوتی جارہی ہے کہ کچھ بنیادی حقائق ایسے ہیں جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ کبھی بدلتے نہیں ہیں؟ جہاں تک ظاہری حالات اور عارضی کیفیات، مادی وسائل اور ذرائع و وسائل کا تعلق ہے وہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں، انھیں کرشمہ کہنا یا ان پر تعجب کرنا ہی غلط ہے، خواہ وہ کتنی ہی غیر معمولی نوعیت کے ہوں جیسا کہ فی زمانہ ہیں۔ اور اُنھیں دنیا کی کسی بھی اسلامی تحریک نے نہ کل نظر انداز کیا تھا نہ آج کر رہی ہے۔

اسی طرح موصوف خدا جانے کن اسلامی تحریکوں کی بات کر رہے ہیں کہ:

☆ ان کا کل کا اسلام کچھ اور تھا اور آج کا کچھ اور؟ وہ غیر مسلم (جاہلی) قوموں میں یا اُن کے ساتھ رہتے بستے ہوئے بھی ان سے کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے باہر باہر سے اُنھیں محض ''فلسفیانہ نصیحتیں نوازنے والا'' بس ایک گروہ بنے ہوئی تھیں؟

انسان کے اجتماعی مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ ''حاکمیت'' کا ہے۔ یعنی یہ کہ کس کی چلے؟ انسان کی یا اللہ کی؟ لیکن موصوف کے اجتماعی مسایل میں سب سے بڑا مسئلہ ہی خارج ہے۔ ذیل میں بانیِ تحریک اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ مضمون نگار اور ان کے ہم خیال حضرات کو تحریک اسلامی اور اس کے مزاج کو سمجھنے میں رہ نمائی ملے اور وہ اپنے خیالات و تصورات پر نظر ثانی فرمائیں:

''قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے: یٰقومِ اعبدو الله، مالکم من اله غیره، خواہ بابل کی سرزمین ہو یا ارضِ سَدُوم یا ملک مَدْیَن یا حجر کا علاقہ یا نیل کی وادی، خواہ وہ چالیسویں صدی قبل مسیح ہو یا بیسویں یا دسویں۔ خواہ غلام قوم ہو یا آزاد، خستہ و درماندہ ہو یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے بام عروج پر، ہر جگہ، ہر دَور میں، ہر قوم میں اللہ کی طرف سے آنے والے رہ نماؤں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ تھی کہ ''اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔''

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میرے اور تمھارے درمیان کوئی تعاون، کوئی اشتراک عمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ تم اس اصل الاصول کو تسلیم نہیں کرتے:

کفرنا بکم و بدا بیننا و بینکم العداوۃ و البغضاء ابدا حتی تومنوا باللہ وحدہ‘

(الممتحنہ. آیت ۴)

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے پاس جاکر ارسل معی بنی اسرائیل کا مطالبہ کرنے سے پہلے انی رسول من رب العلمین (الاعراف۔۱۰۴) کا اعلان کیا، اور ھل لک الی ان تزکی واھدیک الی ربک فتخشی (النازعات۔۱۸،۱۹) کی دعوت دی، اور اسے آگاہ کیا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور جینے کا طریقہ بتایا: ربنا الذی اعطی کل شیء خلقہ ثم ھدی (طٰہٰ۔۵۰) حضرت عیسیٰؑ نے جن کی قوم رومیوں کی غلام ہوچکی تھی، بنی اسرائیل اور آس پاس کی قوموں کو رومن امپیریلزم کے خلاف جنگِ آزادی کے جھنڈے کی طرف دعوت نہ دی بلکہ اس چیز کی طرف دعوت دی کہ ان اللہ ربی وربکم فاعبدوہ‘ ھذ اصراط مستقیم (آل عمران۔۵۱)۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعات جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، کسی اور دنیا کے نہیں، اسی دنیا کے ہیں جس میں ہم رہتے ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء آئے ان میں سرے سے کوئی سیاسی، معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی۔ پس جب یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر رہ نما نے ہر ملک اور ہر زمانے میں تمام وقتی اور مقامی مسائل کو نظر انداز کرکے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اس پر اپنا سارا زور صرف کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ اُم المسائل تھا اور وہ اس کے حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے۔ اب یا تو یہ کہہ دیجیے کہ اسلامی تحریک کے وہ رہ نما جو خدا کی طرف سے آئے تھے، سب عملی سیاست (اور معاشی، معاشرتی اور تمدنی مسائل۔ راقم) سے نابلد تھے، نہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے معاملات میں کون سی چیز مقدّم اور کون سی مؤخّر ہونی چاہیے، یا پھر یہ تسلیم کیجیے کہ اِس دَور میں جو حضرات اسلام کے نمایندے اور مسلمانوں کے قاید و رہ نما بنے ہوے ہیں وہ جزئیات شرع پر کتنا ہی عبور رکھتے ہوں، بہ ہر حال اسلامی تحریک کے مزاج کو وہ نہیں سمجھتے اور نھیں جانتے کہ اس تحریک کو چلانے اور آگے بڑھانے کا کیا طریقہ ہے۔“

”تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہئے کہ بحیثیتِ ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اُس تحریک سے ہے جس کے رہ بر و رہ نما انبیاء تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظام فکر اور ایک

خاص طریق کار ہوتا ہے۔ اسلام کا نظامِ فکر اور طریق کار وہ ہے جو ہم کو انبیاء کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ھم خواہ کسی ملک اور کسی زمانے میں ہوں، اور ہمارے گرد وپیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ھمارے لیے مقصد ونصب العین وہی ہے جو انبیاء کا تھا اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاء ہر زمانے میں چلتے رہے۔ اولـئـک الـذیـن ھدی اللہ، فبداھم اقتدہ. (الانعام. ۹۰) ھمارا معیارِ قدر وہی ہونا چاہیے جو ان کا تھا، ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے انھوں نے دیکھا، اور ھماری اجتماعی پالیسی انھی خطوط پر قائم ہونی چاہیے جن پر انھوں نے قایم کی تھی۔ اس مسلک کو چھوڑ کر اگر ہم کسی دوسرے مسلک کا نظریہ اور طرزِ عمل اختیار کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے۔'' (ترجمان القرآن۔ مئی وجون ۱۹۴۰ء)

''دنیا میں جہاں جو بھی خرابی پائی جاتی ہے اُس کی جڑ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنا۔ یہی اُمّ الخبائث ہے۔ یہی اصل بِس کی گانٹھ ہے۔ اسی سے وہ شجر خبیث پیدا ہوتا ہے جس کی شاخیں پھیل پھیل کر انسانوں پر مصیبتوں کے زہریلے پھل ٹپکاتی ہیں۔ یہ جڑ جب تک باقی ہے، آپ شاخوں کی جتنی چاہیں قطع و برید کرلیں، بجز اس کے کچھ حاصل نہ ہوگا کہ ایک طرف سے مصائب کا نزول بند ہو جائے اور دوسری طرف سے شروع ہو جائے۔'' (ترجمان القرآن۔ مئی وجون ۱۹۴۰ء)

''رسول اللہؐ جب اسلام کی دعوت دینے پر مامور ہوئے تو آپؐ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخنِ تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔............ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہ نمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی، بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سِوا تمام اِلٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اُسی اِلٰہ کی بندگی قبول کرو......اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی وتمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علّت انسان کا آپ اپنا اِلٰہ بننا ہے یا پھر یہ کہ وہ اِلٰہ العٰلمین کے سِوا کسی دوسرے کو صاحبِ امر

کامیاب نہیں ہوسکتی...... محمدؐ نے اسی بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہ راست پیش کر دیا۔ انھوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے۔ پھر اس اثر سے کام لے کر کچھ حاکمانہ اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک لے آئیں۔ یہ سب کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اُٹھا، اور چھوٹتے ہی اس نے لاالٰہ الاالله کا اعلان کر دیا...... اس کی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور جوش نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار ہی یہی ہے۔ وہ اثر ونفوذ واقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں۔ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اِس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہوسکتے ہیں جو آپ کی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سُن کر آئیں۔ اسی چیز میں ان کے لیے کشش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اُٹھیں۔ لہٰذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کا تدبر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا ہی یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اسی دعوت توحید سے کیا جائے۔''

(اسلامی حکومت کس طرح قایم ہوتی ہے'')

فاضل مضمون نگار کے درج ذیل ارشادات بھی ملاحظہ فرمائیں:

''مولانا مودودیؒ کے کارتجدید کے آغاز میں اسلامی نظام کو از سر نو قایم کرنے کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں تھا، لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں ان کا یہ خیال ہوا کہ تحریک اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے موجودہ سیاسی نظام سے بھرپور استفادہ کرے یہاں تک کہ الیکشن میں حصہ لے۔ نیز ان کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان میں یہ پالیسی اور حکمت عملی جماعت اسلامی ہند خود اختیار کرے۔'' (ص:۵۸)

یہاں موصوف نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے تین باتیں خلاف واقعہ پیش کی ہیں۔ اولاً ''مولانا مودودیؒ نے جب تجدید واحیاے دین کا کام شروع کیا تو ان کا مقصد اسلامی نظام قایم کرنے کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں وہ مقصد نہیں رہا بلکہ کچھ اور

ہو گیا۔ مقصد کی تبدیلی کی صراحت بھی موصوف فرمادیتے تو بہتر ہوتا۔ بہ ہر حال یہ ایک صریحاً خلاف واقعہ بات ہے۔ ثانیاً، الیکشن میں حصّہ لینے کا خیال مولاناؒ کو ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ ثالثاً 'مولاناؒ چاہتے تھے کہ جماعت اسلامی ہند الیکشن میں حصّہ لے۔ ان دو غلط بیانیوں اور خلاف واقعہ باتوں پر محترم احسن مستقیمی صاحب نے اپنے مراسلہ (''زندگی نو'' اگست ۲۰۰۹ء) میں سخت اور مدلّل گرفت کی ہے۔ ملاحظہ فرمالیں۔

اسی صفحہ پر مضمون نگار نے دو اور باتیں ایسی کہی ہیں جو خلاف واقعہ معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو مولانا مودودیؒ کے بارے میں کہ انھوں نے (جماعت اسلامی کے قیام کے بعد) آغاز میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا اُس پر وہ جمے نہیں رہے۔ دوسری اخوان المسلمون کے بارے میں کہ سید حسن البناء شہیدؒ کے انتقال کے بعد اخوان نے اپنے اساسی نظریات کو تبدیل کر دیا۔ اتنے بڑے دعوے کرتے وقت ثبوت میں مثالیں، وہ بھی بالکل واضح، پیش کرنا چاہیے۔ لیکن کوئی ایک مثال پیش نہیں کی گئی۔ جہاں تک مولانا مودودیؒ کے طرز فکر کا تعلق ہے اس میں کوئی بنیادی یا نمایاں تبدیلی ہوئی اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ طریقۂ کار میں جزئی تبدیلی کا اطلاق مجموعی طرز فکر و عمل میں تبدیلی پر نہیں ہوتا اور جہاں تک اِخوان کا اپنے اساسی نظریات تک کو تبدیل کر دینے کا تعقل ہے، تو اس ضمن میں بھی کوئی مثال پیش نہیں کی گئی۔ تحریک اسلامی کے اساسی نظریات اسلام کے اساسی نظریات سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں ہوتے۔ پھر اِخوان جیسی اسلامی تحریک اپنے اساسی نظریات کو کیونکر تبدیل کر سکتی ہے؟

☆ ''وہاں کے باشندوں کے شدید اصرار پر حماس نے الیکشن میں شرکت کرنے کا ارادہ کیا۔ حماس کا یہ پختہ ارادہ موجودہ دور میں اسلامی تحریکوں کے الیکشن میں شرکت کرنے کی ضرورت نمایاں کرتا ہے۔'' (ص:٦٦)

کیا موصوف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ حماس نے (فلسطین کے ایک چھوٹے سے نیم آزاد علاقہ کے) باشندوں کے شدید اصرار پر الیکشن میں حصّہ لینے کا پختہ ارادہ کیا، اس لیے اب وہ دنیا کی دیگر تمام اسلامی تحریکوں کے الیکشن میں حصّہ لینے کی ضرورت بن گیا؟ واضح ہو کہ حماس نے الیکشن میں حصّہ لینے کا صرف ارادہ نہیں کیا بلکہ عملاً حصّہ لیا، کامیاب ہوئی ''الفتح'' کے محمود عباس کے زیر صدارت حکومت بھی بنائی۔ لیکن کیا ہوا؟ ''کھڑے بھی ہونے نہ پائے تھے کہ گرا دیے گئے۔'' بالآخر اس نیم آزاد علاقہ میں سے بھی ایک چھوٹے علاقہ غزہ کی پٹی پر قبضہ کر کے (بجا طور پر) اسے

اپنے اقتدار میں لے لیا۔ پھر یہ کہ حماس نے الیکشن میں حصّہ عوام کے شدید اصرار پر لیا اور عوام نے شدید اصرار کیوں کیا، اور اب بھی مشکل ترین حالات میں غزہ پٹی کے باشندے حماس کا مکمل ساتھ کیوں دے رہے ہیں؟ اس لیے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں حماس کا اور اس کے کارکنوں کا اسلامی سیرت و کردار، اس کا اپنے موقف پر سختی کے ساتھ جمے رہنا، اس کا جذبۂ جہاد و قربانی، اس کی تنظیمی پختگی اور صلاحیت، اس کی عوام کے ساتھ سچی ہمدردی و خیر خواہی اور سچی خدمت کا جذبہ۔ اس میں واقعی عبرت کا وافر سامان موجود ہے اسلامی تحریکوں کے لیے کہ وہ اپنے اندر مذکورہ صفات پیدا کریں اور عوام پر اس قدر اثر انداز ہوں کہ وہ اُن کے الیکشن میں حصّہ لینے پر ''شدید اصرار'' کریں اور فیصلہ کن کامیابی سے اُنھیں ہم کنار کرائیں، اور پھر اگر کوئی طاقت آپ کو اقتدار تک پہنچنے نہیں دیتی یا اقتدار سے ہٹا دیتی ہے تو پبلک آپ کا ساتھ نہیں چھوڑتی، بل کہ کہیں نہ کہیں (مثلاً غزّہ کی پٹی ہی سہی) اپنی زمام کار آپ کے ہاتھ میں دینے کا سامان فراہم کر دیتی ہے، اور پورے صبر و ثبات کے ساتھ آپ کی پشت پر کھڑی رہتی ہے۔

☆ ''اس کے بعد انھوں نے (نجم الدین اربکان نے) ''سعادۃ'' پارٹی کی تشکیل کی۔ اس وقت ان کے خاص معتقد اردگان نے اپنی راہ لی ہے اور ان کی Juctice and dev.Party کے لیے حتّی الامکان کوشش کی ہے۔ امریکہ کے ساتھ سمجھوتا کیا۔ اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قایم رکھنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اسلامی ایجنڈے کا اعلان کرنے کے بجائے خدمت خلق میں سرگرم عمل ہو کر سب کی تائید حاصل کی۔ اپنے امیدواروں میں سیکولر سیٹوں کو شامل کیا۔'' (ص:۶۸)

یہ ہے فاضل مضمون نگار کی مطلوبہ تحریک اسلامی، جسے وہ دیگر اسلامی تحریکوں کے لیے ماڈل بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ شاید مضمون نگار ترکی کی موجودہ سیاست اور وہاں کی تحریک اسلامی سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ ترکی میں موجودہ دور کی تحریک اسلامی کی علامت رہے ہیں نجم الدین اربکان، جنھوں نے علامہ نورسیؒ کے بعد تحریک اسلامی کو یہاں تک کھینچ لایا ہے۔ بارہا انھیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیلا گیا (حال ہی میں انھیں رہا کیا گیا)، ان کی سرگرمیوں پر پابندی کی عاید کی گئی، جس نام سے بھی پارٹی بنا کر تحریک چلائی، اس پر پابندی لگائی گئی۔ آخر میں ''السعادۃ'' کے نام سے پارٹی بنائی۔ ترکی کے موجودہ وزیر اعظم رجب طیب اردغان اور صدر عبداللہ گل نے السعادۃ سے علیحدگی اختیار کر کے ''العدالتہ والتنمیہ'' Justice and Dev Party کے نام سے اپنی علیٰحدہ پارٹی بنائی، جو مغربی حلقوں اور ترکی کے سیکولر حلقوں میں ''معتدل اسلام'' کی حامل سمجھی جاتی ہے۔ العدالتہ نے گزشتہ انتخابات میں بھاری

اکثریت حاصل کرکے حکومت بنائی اور ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں، صدارت اور وزارت عظمیٰ پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی حریف بنی ہوئی ہیں۔ نجم الدین اربکان کو حاشیہ پر ڈالنے کی کوشش ہر طرف سے ہورہی ہے، حتّٰی کہ ان کی اپنی پارٹی السعادۃ کے اندر سے بھی نجم الدین اربکان کو گزشتہ دنوں جب قید کیا گیا اور نظر بند رکھا گیا تو اس دوران میں السعادۃ کی صدارت پر تبدیلی پسند نوجوانوں کے نمایندے نعمان کورتلموش فائز ہوگئے، اور اب کرسیِ صدارت نجم الدین اربکان کے لیے خالی کرنا بھی نہیں چاہتے۔ دونوں بعض امور میں ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتے ہیں، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب تلموش نجم الدین اربکان کے معاون کے عہدے پر تھے، اس وقت دونوں کے درمیان اختلاف اس قدر بڑھا کہ تلموش کو استعفیٰ دینا پڑا تھا۔

اب آپ بآسانی اندازہ کرسکتے ہیں کہ موصوف کی ''تحریک اسلامی'' السعادۃ ترکی میں نظام کو قائم کرنے یا اس کے لیے راہ ہموار کرنے میں مددگار ثابت ہوگی، اور نجم الدین اربکان صاحب الیکشن کے ذریعے اسلامی نظام قایم کرنے یا اس کے لیے راہ ہموار کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے یا نہیں۔

☆ ''آج ارکانِ تحریک اسلامی کی یہ رائے بالکل نہیں ہے کہ "الرئیس یولد ولا یصنع" (قاید پیدائشی ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا)...... مغربی افکار اور اسلامی افکار کو ملا کر نیا Module ایجاد کرنے والے ڈاکٹر طارق سوید جیسے لوگ اس میدان میں زیادہ نظر رکھتے ہیں اور تحقیق و تعلیم کا انتظام بھی کررہے ہیں۔'' (ص:۴۷)

مذکورہ عربی مقولے کو موصوف نے ارکانِ تحریک اسلامی کے متّھے منڈھ دیا، جب کہ یہ رائے کسی بھی تحریک کے ارکان کی نہ پہلے کبھی تھی اور نہ آج ہے۔ مغربی افکار اور اسلامی افکار کو ملا کر جو نیا Module ایجاد ہوگا، اس سے تو ہم اپنے لیے، تحریکات اسلامی کے لیے اور اُمّت مسلمہ کے لیے بھی اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

مضمون نگار نے حضورؐ کی مکہ میں کفار و مشرکین سے مصالحت نہ کرنے اور مدینہ میں یہود سے معاہدہ کرنے کا حوالہ دیتے ہوئے دنیا کے موجودہ سیاسی نظام کو برسرِ حق ہونے کا سرٹیفکیٹ بھی عطا کردیا، کیونکہ ''وہ حضورؐ کے دیے گئے دستور العمل کی طرف گامزن ہے۔'' حضورؐ نے مدینہ پہنچ کر اسلامی ریاست کی بنیاد قایم کردینے کے فوراً بعد یہود سے جو معاہدہ کیا تھا اس کی حقیقت کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"وان یهود بن عوف امة مع المؤمنین"

(بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہوں گے)

''بس یہ فقرہ کہ ''یہودی اور مسلمان ایک امت ہوں گے'' یہ دعویٰ کرنے کے لیے کافی سمجھ

لیا گیا کہ آج بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت بن سکتی ہے۔ لیکن یہ بھی لفظی مغالطہ ہے۔ لُغت عرب میں اُمّت سے مراد وہ جماعت ہے جس کو کوئی چیز جمع کرتی ہو، عام اس سے کہ وہ زمانہ ہو، مقام ہو، دین ہو یا کوئی اور چیز........... اس لحاظ سے اگر دو مختلف قومیں کسی ایک مشترک مقصد کے لیے عارض طور پر متفق ہو جائیں تو ان کو بھی ایک اُمّت کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ صاحبِ لسان العرب لکھتے ہیں: **وقوله في الحديث ان يهود بني عوف امة من المؤمنين يريد انهم بالصلح الذى وقع بينهم و بين المؤمنين كجماعة منهم كلمتهم و ايديهم واحده.** (حدیث میں رسول اللہؐ کا یہ ارشاد کہ ''ان یہود بن عوف.....'' اس سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو صلح واقع ہوئی ہے، اس کی وجہ سے وہ گویا مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہو گئے ہیں اور ان کا معاملہ واحد ہے۔)...... اس لُغوی ''اُمّت'' کو آج کی اصطلاح ''متحدہ قومیت'' سے کیا واسطہ؟ زیادہ سے زیادہ اس کو آج کل کی سیاسی زبان میں فوجی اتحاد Military Alliance کہہ سکتے ہیں۔ یہ محض ایک تحالف تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہود اپنے دین پر رہیں گے، دونوں کی تمدنی و سیاسی ہیئتیں الگ الگ رہیں گی۔ البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے اور دونوں اس جنگ میں اپنا اپنا مال خرچ کریں گے۔ دو تین سال کے اندر ہی اس تحالف کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں نے کچھ یہودیوں کو جلاوطن کیا اور کچھ کو ہلاک کر دیا۔ کیا اسی کا نام ''متحدہ قومیت'' ہے؟ کیا کسی معنی میں بھی یہ چیز اس ''متحدہ قومیت'' سے مماثلت رکھتی ہے جو اس وقت معرض بحث میں ہے؟ کیا وہاں کوئی مشترک اسٹیٹ بنایا گیا تھا؟ کیا وہاں کوئی مشترک مجلس قانون ساز بنائی گئی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ یہودی اور مسلمان ایک مجموعہ ہوں گے اور اس مجموعے میں سے جس کی اکثریت ہوگی وہی مدینہ پر حکومت کرے گا اور اس کے منظور کیے ہوئے قوانین مدینہ میں نافذ ہوں گے؟ کیا وہاں مشترک عدالتیں قائم ہوئی تھیں جن میں یہودیوں اور مسلمانوں کے قضا کا یکجا اور ایک ہی ملکی قانون کے تحت فیصلہ ہوتا ہو؟

(مولانا مودودیؒ۔ ''متحدّہ قومیت اور اسلام'')

واضح ہو کہ اسلامی ریاست یا حکومت میں غیر مسلموں کی حیثیت ''ذمّی'' کی ہوتی ہے۔ اگر اسلامی حکومت یا اسلامی نظام قایم نہیں ہے لیکن سماج مشترک یا تکثیری ہے، تو ایسی صورت میں اہل ایمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے نظریہ (یعنی ایک ملک یا علاقہ میں بسنے والے تمام

باشندے ایک قوم ہیں خواہ ان کا تعلق مختلف قوموں سے ہو، اور اس ''قوم'' میں سے جس گروہ کو اکثریت حاصل ہو وہ حکومت کرے) کے تحت غیر مسلم قوموں سے مل کر ایک قوم بن جائیں اور اپنے اجتماعی امور یا مسائل کے سلسلے میں (مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں) ایسی اجتماعی ہیئت کو تسلیم کریں اور اس کا ساتھ دیں جس کا دستور انسانوں کو اس امر کا اختیار دیتا ہو کہ وہ ان مسائل کے متعلق قانون بنائیں یا اُن مسائل کا تصفیہ کریں جن پر خدا اور اس کا رسول پہلے اپنا ناطق فیصلہ دے چکا ہے۔

مضمون نگار نے اِخوان المسلمون کے موقف ''اسلامی ملک میں خلیفہ مسلمان اور مرد ہونا چاہیے'' کی مخالفت میں (یعنی خلیفہ غیر مسلم کو بھی بنایا جا سکتا ہے اور عورت کو بھی، اس کی تائید میں) تیونس کے شیخ راشد الغنوشی (جو فی الحال فرانس میں جلاوطن کی زندگی گزار رہے ہیں) کے فتوؤں کو بھی نقل کیا ہے اور یوروپی فتویٰ کونسل کے اس فتویٰ کو بھی تائیداً نقل کیا ہے کہ ''یوروپ اور امریکہ کے اسلام مخالف سامراجی حکومت ہونے کے باوجود یوروپی اور امریکی لشکروں میں مسلمان خدمت کر سکتے ہیں، حتّٰی کہ مسلم ملک کے خلاف جنگ کرنے کے مطالبے کو بھی قبول کر سکتے ہیں۔'' انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بہ ہر حال اس طرح کے فتوے نہ تحریک اسلامی قبول کرے گی اور نہ امّت مسلمہ ہی قبول کرنے والی ہے۔

★★